بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

اس مرتبہ ترجمان القرآن میں "تفہیم القرآن" کا حصّہ شائع نہیں ہو رہا اس کی وجہ، جیسا کہ احباب کو معلوم ہی ہے، محترم مولانا مودودی کی علالت ہے۔ شافیِ مطلق کے حضور میں دعا ہے کہ وہ مولانا کو جلد از جلد مکمل طور پر صحت یاب فرمائے تاکہ وہ دینی امور و مشاغل کی انجام دہی میں حسبِ معمول منہمک ہو سکیں۔ اُن کی علالت پاکستان کے دینی حلقوں کے لیے ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام کے لیے سخت وجہِ اضطراب ہے۔ خصوصاً موجودہ پریشان کُن حالات میں اسلامی محاذ پر ان کی سخت ضرورت محسوس کی جا رہی ہے اور جو لوگ اس محاذ پر کام کر رہے ہیں وہ ہر قدم پر اپنے آپ کو ان کی رہنمائی کے محتاج پاتے ہیں۔ ترجمان القرآن کے قارئین سے درخواست ہے کہ وہ مولانا کی صحت یابی کے لیے دُعا فرمائیں۔

اس وقت ملک جس شدید بحران سے گذر رہا ہے یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں جو اچانک ملک میں رُونما ہو گیا ہے بلکہ یہ فطری نتیجہ ہے اُن غیر اسلامی رجحانات اور قوتوں کا جو اس ملک میں عرصہ دراز سے کام کر رہی ہیں۔ یہ وقت اب کسی کو کوسنے یا ایک دوسرے پر الزام لگانے کا نہیں بلکہ اس امر کا جائزہ لینے کا ہے کہ وہ کونسے اسباب اور کوتاہیاں تھیں جن کی وجہ سے ملک اس مصیبت میں گرفتار ہوا ہے۔ یہ قائدین جنہیں اس وقت موردِ الزام ٹھہرایا جا رہا ہے یا جن کی بے تدبیری اور ہٹ دھرمی کو ان وحشت ناک حالات کا ذمہ دار قرار دیا جا رہا ہے۔ اُنہیں خود انہی غلط رجحانات کے ریلے نے اُبھارا ہے۔ اگر

ملک صحیح راہ پر گامزن ہوتا تو پھر اُن کے اُبھرنے کے کوئی امکانات نہ تھے۔ اس وقت اس ملک کو ہی نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام کو دو چیزوں کی ضرورت ہے ایک انابت الی اللہ اور دوسرے تدبر و تفکر اور حالات کی صحیح سمجھ بوجھ اور تعمیری کام کے لیے پختہ عزم۔

اگر تاریخ کا اپنے آپ کو دُہرانا ایک مسلّمہ حقیقت ہے تو پھر اس امر سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہم آج حوادث کے اُسی دَور میں سے گذر رہے ہیں جو خلافتِ عثمانیہ کے خاتمے کے وقت مسلمانوں کو پیش آئے۔ اس خلافت میں لاکھ خامیاں سہی مگر یہ بات تو اپنی جگہ مسلّم ہے کہ اس سے مسلمانوں کے اندر یہ احساس تو کسی نہ کسی طرح قائم تھا کہ ان کی شیرازہ بندی خاک و خون کے رشتوں سے نہیں ہوئی بلکہ خالص روحانی بنیادوں پر ہوئی ہے۔ اس احساس کے یُوں تو متعدد فوائد تھے مگر تین خاص طور پر نمایاں ہیں: ایک یہ کہ مسلمان خواہ کسی ملک، قبیلے، رنگ اور نسل سے تعلق رکھتا تھا مگر اُس کے اندر اس خلافت کی وجہ سے یہ احساس پُوری طرح موجود رہتا تھا کہ وہ چونکہ ایک بین الاقوامی برادری کا رُکن ہے اس لیے اُسے وطنی اور نسلی مفادات سے بلند تر ہو کر سوچنا چاہیے۔ گذشتہ دو تین سو سال میں وہ کونسی ایسی اُفتاد ہے جو مسلمانوں پر نہیں پڑی۔ مغربی قوموں نے انہیں غلام بنایا، انہیں دنیا میں ذلیل و خوار کیا، ان کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لُوٹا، ان پر ناقابلِ بیان مظالم ڈھائے مگر ان سارے مصائب کو مسلمانوں نے یک جان ہو کر برداشت کیا اور ایک خطّۂ ارضی میں رہنے والے خدا کے بندوں نے اپنے دکھوں کو نظر انداز کرتے ہوئے دوسرے ممالک میں بسنے والے اپنے بھائیوں کی پریشانیوں کو زیادہ شدّت سے محسوس کیا اور انھیں اپنے محدود وسائل کی حد تک دُور کرنے کی کوشش کی۔ انہیں اپنی مظلومیت سے کہیں زیادہ اپنے بھائیوں کی مظلومیت کی فکر دامنگیر رہتی تھی۔ اس حدیث کی مکمل تصویر نہ سہی مگر ایک حد تک مسلمانوں کے اس احساس کو دیکھتے ہوئے اس صادق و مصدوق صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ضرور سامنے آجاتا ہے کہ یہ امّت جسدِ واحد کی مانند ہے جس کے اگر کسی عضو کو بھی تکلیف ہو تو پُورا جسم ایک کرب محسوس کرتا ہے۔

اس احساس کا دوسرا فائدہ یہ تھا کہ جس دین کی بدولت انہیں ایک بین الاقوامی برادری بننے کا شرف حاصل ہوا ہے وہ اس کے بارے میں حد درجہ محتاط اور حساس رہتے اور اس پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے دیتے کیونکہ وہ بالکل صحیح طور پر سمجھتے تھے کہ اُن کی اجتماعی زندگی صرف اس دین کی رہینِ منت ہے۔ اگر اس میں کوئی ضعف پیدا ہو گیا تو ان کا شیرازہ بکھر جائے گا۔ چنانچہ اس ملت کے بہی خواہ ہمیشہ اس بات کا اہتمام کرتے رہے کہ مسلم قوم کا اس دین سے تعلق بڑا گہرا ہو اور دنیا کے سارے مسلمان صبغۃ اللہ میں رنگ جائیں۔ اس غرض کے لیے مختلف دینی تحریکات مختلف طبقات اور مختلف حلقوں میں برابر سرگرم عمل رہتیں۔ وہ ایک طرف تو مسلمانوں کے اندر دین کی شمع روشن رکھنے کی کوشش کرتیں اور دوسری طرف اس بات کا بھی خاص طور پر خیال رکھتیں کہ الحاد اور بے دینی کی تاریکیاں ان پر یلغار کر کے کہیں اُن کی زندگیوں کو تاریک نہ بنا دیں چنانچہ جاہلیت کی اُن تاریکیوں سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے اس ملت کے خیر خواہوں نے ہر میدان میں بھرپور کوششیں کیں۔ یہ غالباً اُن پاکباز لوگوں کی کوششوں کا نتیجہ ہے کہ دو تین سو سال کی غلامی کے بعد بھی مسلمانوں کا اسلام سے کسی نہ کسی طرح تعلق باقی ہے۔ اور ان کی معاشرتی زندگی میں اس کے واضح اثرات دکھائی دیتے ہیں۔

تیسرے اسلام سے وابستگی کی وجہ سے مسلمانوں کے اندر کوئی ایسی قیادت اُبھرنے کی جرأت نہ کر سکتی تھی جو دینِ حق کے ماسوا کسی نظامِ باطل کی علمبردار ہو۔ مسلمان ایک چیز ہی جانتے تھے کہ سو فیصد حق اسلام اور صرف اسلام ہے۔ اس کی مخلصانہ پیروی سے اُن کی دنیوی اور اُخروی فلاح وابستہ ہے۔ یہی اُن کی قوت کا واحد سرچشمہ اور ان کے سارے دکھوں کا مداوا ہے۔ اس لیے اُنہیں اصلاحِ احوال کے لیے صرف اسی کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ اس دین کے مقابلے میں ان کی نظر میں ہر چیز ہیچ بلکہ فضول تھی۔ یہ بات کبھی ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ آسکتی تھی کہ اس دین کو چھوڑ کر وہ کبھی خیر اور بھلائی کی راہ پا سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ کسی شخص کو یہ ہمت نہ پڑتی تھی کہ وہ اسلام کے علاوہ کسی دوسرے نعرے پر مسلمانوں کو اپنے گرد جمع کر سکے۔ جو فرد بھی اس ملت کی محبت کا دم بھرتا اسے سب سے پہلے یہ ثابت کرنا پڑتا

کہ اس کا دل اسلام کی محبت سے معمور ہے اور وہ فکر و نگاہ اور سیرت و کردار کے اعتبار سے مسلمان ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری پوری تاریخ میں مسلم قیادت ایک خاص دینی مزاج اور اخلاقی معیار کی حامل رہی ہے۔ دوسرے ممالک کو چھوڑ دیجیے خود اس برصغیر پاک و ہند میں دیکھیے کہ مسلمانوں کے اندر گذشتہ دو سو سال میں کس قسم کی قیادت اُبھرتی رہی۔ شاہ ولی اللہؒ اور ان کا خاندان جس کے ہاتھ میں ایک طویل مدت تک مسلمانوں کی سربراہی کا منصب رہا اُس کی دینی خدمت سے کون مسلمان ناواقف ہے اُس کی مساعی نے شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور سید احمد بریلویؒ جیسے مجاہدینِ اسلام کو پیدا کیا۔ دیوبند، ندوہ، علی گڑھ بھی احیائے اسلام کی کوششوں کے مختلف مظاہر ہیں۔ تحریکِ خلافت نے محمد علی جوہرؒ، ظفر علیؒ اور اسی طرح کے دوسرے انگریزی تعلیم یافتہ مسٹروں کو مولانا بنا دیا۔ اقبال مرحوم اور قائد اعظم اسلام سے تعلق کی وجہ سے مسلمانوں میں مقبول ہوئے اور اسی نسبت کی بنا پر پوری قوم نے نہ صرف انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا بلکہ اُن کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اُن کے ساتھ جد و جہد میں شریک ہوئے۔

اسے مسلم قوم کی بدقسمتی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ خلافت کی قبا چاک ہونے کے ساتھ ہی مسلمانوں کے اندر ایک بین الاقوامی برادری سے تعلق رکھنے کا احساس آہستہ آہستہ ختم ہونے لگا اور انھوں نے بھی مغربی اقوام کی پیروی میں وطن، زبان اور نسل کو اپنی قومیت کی بنیاد سمجھ کر مادی اور وطنی مفادات کو اسلامی روابط پر ترجیح دینا شروع کیا۔ اور اس طرح ملتِ اسلامیہ چھوٹی چھوٹی قومیتوں میں بٹ کر رہ گئی۔

ان نئی بنیادوں پر قومیت کی تشکیل کے لیے صرف یہی بات کافی نہ تھی کہ ایک خطۂ ارضی کے رہنے والے مسلمان اپنے اپنے ملک کے اندر سمٹ کر بیٹھ جائیں اور وہاں اسلام کے تقاضوں کو کسی نہ کسی طور پورا کرتے رہیں بلکہ اس نئی قومیت کے مطالبات کو پورا کرنے کے لیے انہیں اپنے اندر وہ سارے منفی جذبات پالنے پڑے جو مغرب کی جارحانہ قوم پرستی کے لیے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ ذیل میں ہم اُن کی مختصر الفاظ میں نشاندہی کرتے ہیں۔

انسان جس سرزمین میں پیدا ہوتا ہے اُس سے اُسے بالکل فطری طور پر محبت ہوتی ہے ایک مسلمان

بھی اس جذبہ سے محروم نہیں ہو سکتا مگر نئی قومیت نے وطن کی محبت کے بجائے وطن کی پرستش کا پرچار کیا اور خاکِ وطن سے اُس طرح کا تعلق پیدا کرنے کی تلقین کی جس طرح کہ کوئی خدا پرست اپنے معبودِ حقیقی سے پیدا کرتا ہے۔ اس سے ایک تو انسان زندگی کی اعلیٰ اور ارفع قدروں سے بیگانہ ہوئے کیونکہ وطن اور اہلِ وطن کے مادی مفادات ان کے لیے دنیا کی ہر چیز سے عزیز تر قرار پائے۔ دوسرے انہوں نے پوری انسانیت سے کٹ کر ایک محدود دائرے کے اندر رہنا اور اس کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ اُس طرح ان کے اندر تنگ نظری اور تعصب پیدا ہوا۔ ان کے نزدیک انسان کہلانے کے صرف وہی لوگ مستحق تھے جو اُن کے ملک کی چار دیواری کے اندر رہنے والے تھے باقی انسان اُن کی نگاہ میں انسانیت کے شرف سے یکسر محروم تھے۔ اس طرزِ فکر کا نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کے ہر ملک کے بسنے والوں نے اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تشکیل اس نہج پر کی جس سے اس قسم کے منفی جذبات کو تقویت حاصل ہو۔ نظامِ تعلیم بھی اسی مقصد کو سامنے رکھ کر مرتب کیا جانے لگا۔ مختلف ممالک میں دستور و آئین کے جو ڈھانچے تیار ہوتے وہ بھی ہر قوم نے اپنے مخصوص قومی مفادات کے پیشِ نظر تیار کیے۔ الغرض دنیا میں کسی ایک جگہ بھی انسانوں کا کوئی ایسا گروہ موجود نہ رہا جنہیں انسانیت اور اُس کے وسیع تر مفادات سے محبت ہو۔ پوری دنیا تعصبات سے بھر گئی۔

ان منفی جذبات کے اندر زیادہ زور اور توانائی پیدا کرنے کے لیے یہ بات ضروری تھی کہ دنیا کی ہر قوم دوسری اقوام کے خلاف پوری شدت سے نفرت کی آگ بھڑکائے کیونکہ اس نفرت ہی سے اس کے اندر اتفاق و اتحاد کی راہ ہموار ہو سکتی تھی۔ اسی غرض کے لیے سب سے آسان طریقہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو مظلوم اور دوسری قوموں کو ظالم ثابت کیا جاتا۔ کسی مظلوم قوم کو تو خیر یہ حق ہے کہ وہ ظالم قوم کی ظلم و زیادتی کے خلاف آواز بلند کرے اور اپنے عوام کے اندر یہ احساس پیدا کرے کہ انہیں اس سے نجات ملنی چاہیے مگر جارحانہ قوم پرستی کے اس جنون نے قوموں کے اخلاق کو اس حد تک تباہ کر دیا ہے کہ ظالم قومیں بھی بڑی بے شرمی کے ساتھ اپنے مظلوم ہونے کی دہائی دیتی ہیں اور فی الحقیقت جو قومیں ظلم کا شکار ہو رہی ہیں اُن کی طرف بعض جھوٹی باتیں منسوب کر کے ان کی چیرہ دستیوں کے افسانے

گھڑ کر انہیں پہلے تو بدنام کرتی ہیں اور پھر ان جھوٹے اور بے بنیاد الزامات کی آڑ لے کر ان پر دستِ ظلم دراز کرنے لگتی ہیں۔

ظاہر بات ہے کہ کسی قوم کے اندر اس قسم کے غلط رجحانات اخلاقی احساس رکھنے والے اور انسانیت کے بہی خواہ تو نہیں پھیلا سکتے۔ اس منفی کام کی انجام دہی کے لیے وہی لوگ زیادہ موزوں ہو سکتے ہیں جو متعصب، تنگ نظر اور پرلے درجے کے حریص ہوں، جو عوام کے جذبات سے کھیلنے میں بڑی مہارت اور چابکدستی رکھتے ہوں، جن کے دل میں نام و نمود اور اقتدار کی خواہش کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہو اور اس خواہش کی تکمیل کے لیے وہ تمام ایسے کام کرنے پر تیار رہوں جن سے کسی ملک کی فضا میں سنسنی پیدا کی جا سکے اور اخلاقی اعتبار سے اس قدر دیوالیہ ہوں کہ اگر انہیں اپنے آپ کو نمایاں کرنے کے لیے پوری قوم کے مفاد کو داؤں پر لگانا پڑے تو اس میں بھی انھیں قطعاً کوئی باک محسوس نہ ہو۔

دورِ جدید میں مختلف ممالک کے اندر اُبھرنے والی قیادتوں پر اگر نگاہ ڈالیں تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان میں سے اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جنہیں قوم کے اندر منفی جذبات کی پرورش کرنے میں کمال حاصل ہے۔ ایسے لوگوں نے کبھی بھی قوت اور ہمت کے ساتھ قوم کے غلط رجحانات کو صحیح رُخ پر موڑنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان رجحانات میں مزید بگاڑ پیدا کر کے قوم کو بڑی تیزی کے ساتھ بربادی کی راہ پر دھکیلنے کا سامان کیا ہے۔ یہ طالع آزما رہنما سب سے پہلے یہ دیکھتے ہیں کہ قوم کے مختلف طبقوں کے اندر کیا کیا خامیاں پائی جاتی ہیں اور انہیں کن کن محرومیوں کا احساس ہے۔ ان دو چیزوں کا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد پھر یہ لوگ ان خامیوں اور محرومیوں سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان رہنماؤں کا حال ان نشہ آور اشیاء فروخت کرنے والوں کا سا ہے جو ہر وقت نہ صرف گاہکوں کی تلاش میں لگے رہتے ہیں بلکہ نئے نئے گاہک تیار کرنے میں مصروف رہتے ہیں۔ اس غلط ذہنیت کے لوگ آخر عوام کی اصلاح کس طرح کر سکتے ہیں۔ ایک صحیح قائد کا فرض تو یہ ہے کہ قوم جن جن برائیوں میں گرفتار ہے وہ ان کی نشاندہی کرے، ان کے خلاف عوام کے اندر گہرا احساس پیدا کرے اور پھر انہیں اس بات

پر آمادہ کرے کہ انہیں ان برائیوں سے نجات حاصل کرنی ہے۔ مگر یہ کام بڑا صبر آزما کام ہے۔ قوم کو اچھے اور پاکیزہ مقصد کی خاطر اپنے پیچھے لگانے کے لیے قائد کو نہ صرف بڑے ایثار سے کام لینا پڑتا ہے بلکہ خود اپنے آپ کو اچھی سیرت کا نمونہ بھی بنانا پڑتا ہے۔ اس ایجابی کام سے دوسرا سلبی کام بہت زیادہ سہل اور آسان ہے، یعنی قوم جس غلط راہ پر گامزن ہے اسے نہ صرف اس پر چلنے دیا جائے بلکہ اس غلط سمت میں اس سے آگے بڑھ کر اسے پیچھے لگا لیا جائے۔ جس طرح ایک شرابی شراب کے نشے میں بدمست ہو کر اپنا حقیقی خیر خواہ اس شخص کو خیال کرتا ہے جو اُس کے لیے اس ام الخبائث کے زیادہ سے زیادہ جام لنڈھا سکے اور وہ اُس شخص کو اپنا دشمن تصور کرتا ہے جو اسے اس برائی سے باز رہنے کی تلقین کرے، بالکل اسی طرح جب کسی قوم کے اندر بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو وہ ان لوگوں کی قیادت اور سیادت قبول کرتی ہے جو انہیں بگاڑ سے نکالنے کے بجائے اس میں مزید بگاڑ پیدا کرنے کی بدرجہ اتم صلاحیت رکھتے ہوں۔ وہ عقل کی بات سمجھانے والوں کو اپنا دشمن اور بربادی کی راہ پر لے جانے والوں کو اپنا بہی خواہ خیال کرتی ہے۔ گذشتہ دو سو سال میں دنیا کے اندر جس قدر تباہی آئی ہے اور انسانیت کو جو بے پناہ مصائب جھیلنے پڑے ہیں وہ سب اس غلط قیادت کی ہیجان انگیزیوں کے بالکل فطری ثمرات ہیں۔

مسلمان قوم کے لیے اُس دن سے زیادہ کوئی منحوس دن نہ تھا جب اُس کے اندر جارحانہ قوم پرستی کے جراثیم پھیلنے شروع ہوئے۔ مغربی اقوام خصوصاً یہودی عرصہ دراز سے اس ٹوہ میں لگے ہوئے تھے کہ وہ کونسی ایسی تدبیر ہو سکتی ہے جو مسلمانوں کے شیرازہ کو منتشر کر سکے۔ اس ناپاک مقصد کے حصول کے لیے یوں تو مختلف ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے رہے اور اب بھی کیے جا رہے ہیں مگر ان میں سب سے زیادہ مؤثر اور نتیجہ خیز تجویز یہی تھی کہ کسی طرح مسلمانوں کے اندر مغربی قومیت کے تصورات کو رواج دیا جائے کیونکہ اُن کے سرایت کر جانے کے بعد انہیں کوئی چیز تباہ ہونے سے بچا نہ سکے گی۔ پھر یہ کام بھی نسبتاً آسان ہے اور اسے غیر محسوس طور پر بغیر خطرے کا

کوئی الزام پیدا کیے آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کے دشمنوں نے اس کا آغاز وطن کی محبت کے فطری جذبے سے کیا۔ پھر مسلمانوں کے اندر یہ احساس پیدا کیا کہ وطن کے مفادات دوسرے سارے مفادات سے عزیز تر ہونے چاہییں اور کسی دوسرے ملک کے رہنے والے مسلمان اس بات کا حق نہیں رکھتے کہ ان کی خاطر انہیں قربان کیا جا سکے۔ اسلام کا رشتہ مقدس سہی مگر اسے وطن کے رشتے پر غالب نہ آنے دیا جائے۔ اسی طرح آہستہ آہستہ مسلمانوں کے اندر وطن پرستی کے جذبات پیدا کیے گئے۔ مسلم قوم کے اندر اسلام نے جس احساس کی آبیاری کی تھی وہ یہ تھی کہ اُس کے ہر فرد کو اوّل و آخر مسلمان ہونا چاہیے اور اللہ کے دین کی خاطر ہی اسے زندہ رہنا اور مرنا چاہیے۔ اس ایک مقصد کے مقابلے میں باقی سب مقاصد غلط اور بیکار ہیں۔ پھر آہستہ آہستہ خدا کی محبت کے ساتھ وطن کی محبت کا سلسلہ شروع ہوا اور دینی مفادات کے پہلو بہ پہلو وطنی مفادات بھی اُبھرنے لگے۔ مگر یہ صورتِ حال زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی، کیونکہ دنیا کی ہر قوم کو قدم قدم پر یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اُس کے نزدیک زندگی کا اہم ترین مقصد کونسا ہے اور اس کی روشنی میں اس کی سب سے قیمتی متاع کیا ہے اور اسے حاصل کرنے کے لیے اُسے جدوجہد کا کونسا انداز اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کو بھی وطن پرستی اور خدا پرستی، دینی تقاضوں اور وطنی مفادات کے درمیان جلد فیصلہ کرنا پڑا کیونکہ یہ فیصلہ کیے بغیر ان کا زندہ رہنا ممکن نہ تھا۔ انہوں نے شروع میں تو اس ذہنی کشمکش کو ملّت اور قوم کے درمیان لفظی تفریق کر کے اُسے چھپانے کی کوشش کی مگر خدا کی پرستش اور وطن کی پرستش کو چونکہ بیک وقت نبھانا ناممکنات میں سے ہے اس لیے انہوں نے جلد ہی یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ پہلے وطن کے پرستار ہیں اور بعد میں خداوند تعالیٰ کے اطاعت شعار۔ مغرب نے قومیت کا جو نیا مذہب پیش کیا ہے اس میں یُوں تو سوائے مذہب وطنیت کے کسی دوسرے جاندار مذہب کے وجود کی کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی مگر خاص طور پر اسلام کو تو وہاں کسی صورت بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام ایک ہمہ گیر نظامِ حیات ہے جو زندگی کے سارے گوشوں پر حاوی ہے۔ وہ وطن کے بارے میں بھی ایک خاص زاویۂ نگاہ رکھتا ہے جو اس فلسفے سے براہِ راست متصادم ہے جسے مغربی قوم پرستی نے جنم دیا ہے اس لیے وہ قوم جو ایک ہی وقت میں اسلام اور مغربی قومیت کے نظریہ کو اپنانے کی کوشش کرتی ہے

وہ جلد از جلد انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔ اگر وہ ملکی اور قومی مفادات کو اولیت کا درجہ دیتی ہے تو اسے بہت سے دینی تقاضے پس پُشت ڈالنے پڑتے ہیں اور اگر وہ دینی تقاضوں کو پُورا کرنے کی کوشش کرتی ہے تو وہ بہت سے قومی مفادات نظر انداز کرنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ جس طرح کوئی فرد بیک وقت دو مخالف سمت میں چلنے والی کشتیوں میں پاؤں نہیں رکھ سکتا بالکل اسی طرح ملّتِ اسلامیہ اسلام اور مغربی قومیت کو ایک ہی وقت میں اپنا کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اسے دونوں میں بہرحال ایک کا انتخاب کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ دو تین ممالک کو چھوڑ کر دنیا کے تمام مسلم ممالک نے وطن پرستی کا مسلک اختیار کیا۔ اور اس کے تقاضوں کے تحت اپنی قومی زندگی کی تشکیل شروع کی۔ اسلام وہاں سے بالکل نیست و نابود تو نہ ہو سکا مگر وہ کوئی انقلاب انگیز قوت کی حیثیت سے بھی باقی نہ رہا۔ وہاں کے عوام نے اسے چند بے جان رسوم کا مجموعہ سمجھ کر اپنے سینے سے لگائے رکھا۔ اس حیثیت میں آخر کوئی دین کتنے دنوں تک زندہ رہ سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ کا دین وطنیت کے ہر آن بڑھتے ہوئے تقاضوں کے پیشِ نظر زندگی کے ہر میدان میں اپنی بساط لپیٹتا چلا گیا اور بالآخر مسلم ممالک میں بالکل مغلوب و مفلوج ہو کر رہ گیا۔

جو دو تین مسلم ممالک وطن پرستی کے اس حملے سے محفوظ رہے ان میں سرِ فہرست پاکستان ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ یہ ملک وطن پرستی کے خلاف مسلسل جہاد اور اس دینِ باطل پر دینِ حق کے تسلط اور غلبے کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آیا ہے تو یہ زیادہ صحیح ہوگا۔ یہ قدرت کا ایک بہت بڑا کرشمہ ہے کہ برصغیر ہند و پاک کی جو زمین مذہبِ وطنیت کی عملداری کے لیے سب سے زیادہ موزوں تھی اسی میں اسے شکست اٹھانا پڑی اور یہاں مسلمانوں نے اس حقیقت کو ثابت کر دیا کہ اسلام کا رشتہ خاک و خون کے رشتوں سے کہیں زیادہ مضبوط اور قوی ہے۔ جن ممالک میں مسلمانوں کی آبادی نوّے اور اسّی فیصد ہے وہاں تو انہوں نے مذہب کے بُت کی پرستش شروع کر دی ہے مگر جس ملک میں ان کی آبادی ۲۵ فیصد سے بھی کم تھی وہاں اُنھیں اللہ تعالیٰ نے علمِ حق بلند کرنے کی توفیق دی اور انہوں نے اللہ کے مطیع و فرمانبردار بندوں کی طرح پُوری دنیا کے سامنے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ اوّل و آخر مسلمان ہیں۔ وطن سے انہیں بھی محبت ہے مگر اس محبت کا

یہ مطلب نہیں کہ وہ فلسفہ وطنیت کی کوئی ایسی صورت گوارا کریں جو اسلامی تعلیمات سے متصادم ہو۔ وہ آزادیٔ وطن اور تعمیرِ وطن کے لیے اپنے سامنے جو نقشہ رکھتے ہیں اُس میں اسلام نے رنگ بھرا ہے۔ وہ وطنی تقاضوں سے صرفِ نظر کرنا نہیں چاہتے مگر انہیں اس انداز سے پورا کرنے کے آرزو مند ہیں جو اسلام نے سکھلایا ہے۔ ان کی قوت کے چشمے خاکِ وطن کی محبت سے نہیں اُبلتے بلکہ خدا اور اس کے رسول کی محبت سے اُبلتے ہیں۔ اللہ کے دین نے جو حیثیت وطن کو دی ہے وہ اسے اسی حیثیت پر رکھنے کے متمنی ہیں۔ اسے خدا کے مقام پر فائز کرنے کے لیے کسی صورت بھی تیار نہیں ہو سکتے کیونکہ یہ ان کے نزدیک کفر ہے۔

وطن پرستی کے اس دور میں یہ نظریہ پوری دنیا کے لیے بڑا حیران کن تھا مگر اس برصغیر کے مسلمانوں کے لیے یہ اُن کے دل کی آواز تھی۔ انہیں بعض تاریخی اسباب کی وجہ سے اس دین کی اہمیت کا پوری طرح احساس تھا۔ وہ اس بات کو اچھی طرح جانتے تھے کہ اس دین کی بدولت ان کا الگ ملی وجود قائم ہے اور وہ ہندو قومیت کی یلغار سے محفوظ ہیں۔ اس سرزمین میں لاتعداد قومیں نمودار ہوئیں مگر ان کا کوئی نام و نشان باقی نہیں رہا۔ انہیں نہ تو زمین نگل گئی ہے اور نہ آسمان اُچک کر لے گیا ہے بلکہ انہیں ہندو قومیت کا دیوِ استبداد نگل گیا مگر مسلم قوم نے اسلام کی قوت کی وجہ سے اس دیو کے دانت کھٹے کر دیئے اور اس سے یہ بات تسلیم کرا لی ہے کہ اسے ایک الگ قوم کی حیثیت سے ایک علیحدہ وطن میں باعزت طور پر جینے کا حق ہے۔

پاک و ہند کی سرزمین میں مسلمانوں پر اسلام کا دوسرا بڑا احسان یہ رہا ہے کہ اُن کے ہاں نہ تو آج سے پہلے ملحدانہ تحریکات کی پذیرائی ہوئی اور نہ الحاد کی علمبردار قیادت کو سر اٹھانے کا موقع ملا۔ جس تحریک یا جس شخصیت کا اسلام سے جس قدر تعلق کم تھا اسے مسلم قوم کے اجتماعی ضمیر نے اسی نسبت سے مسترد کر دیا۔ مسلم معاشرے نے بعض بڑے نامور مفکر، ادیب، سیاستدان اور منتظمین پیدا کیے مگر مسلمانوں نے ان میں کسی ایک کی بھی محض اس وصف کی بنا پر پذیرائی نہیں کی بلکہ انہیں اگر اپنے دل میں عزت و احترام کا کوئی مقام دیا تو اس کی وجہ ان کی اللہ کے دین سے وابستگی تھی۔ اس حقیقت کو جاننے کے لیے کسی لمبی چوڑی تحقیق

کی ضرورت نہیں۔ اس ملک کی تاریخ پر سرسری نگاہ ڈالنے سے اس کے بے شمار ثبوت فراہم کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً یہ دیکھیے کہ اس برصغیر میں مسلم قوم میں کتنے ایسے صاحبِ اختیار بادشاہ پیدا ہوئے ہیں جو اپنی قوت و طاقت کے اعتبار سے غیر معمولی طور پر نمایاں تھے مگر ان بادشاہوں کے مقابلے میں شہرت و ناموری ان بندگانِ خدا کے حصے میں آئی ہے جن کا سرمایہ بجز زہد و تقویٰ کے اور کوئی چیز نہ تھی۔ اکبر اور جہانگیر کے مقابلے میں مجددالف ثانیؒ کی بے مثال مقبولیت اس دعویٰ کی واضح شہادت پیش کرتی ہے۔ پھر خود ان بادشاہوں کے درمیان مسلمانوں نے صرف دین کی بنیاد پر تفریق کی اور جسے جس قدر دین کے قریب پایا اسے اسی قدر عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھا اور جسے دین سے جس قدر دُور پایا اسی تناسب سے اس کے خلاف نفرت کا اظہار کیا۔ ناصرالدین محمودؒ کے بارے میں مسلمان جو عقیدت کے نہایت گہرے جذبات رکھتے ہیں اس کی وجہ سوائے اس فقیر بادشاہ کی پرہیزگاری اور خدا ترسی کے اور کیا ہے اور جلال الدین اکبر اپنی ساری صلاحیتوں اور انتظامی کارناموں کے باوجود اگر مسلمانوں کی نظر میں قابلِ نفرت ہے تو اس کا سبب بھی اس کا دینِ حق سے انحراف ہے۔

مسلم حکومت کے خاتمے کے بعد بھی مسلمانوں کے اس طرزِ فکر میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہ ہوئی۔ انہوں نے بلاشبہ اسلام کے نام پر بعض تحریکوں اور بعض شخصیتوں کے بارے میں دھوکہ کھایا مگر اسلام کو ان کے ہاں ہمیشہ اولیت کا مقام ہی حاصل رہا۔ مغرب کی الحاد پرستی نے اس قوم میں بڑے ضرر رساں اثرات مرتب کیے مگر اس قوم نے اپنی ساری اعتقادی اور عملی کوتاہیوں کے باوجود اسلام سے بغاوت کی راہ اختیار نہ کی بلکہ اس کے دل میں ہمیشہ یہ خواہش موجزن رہی کہ اس کی اجتماعی زندگی کی تعمیر اسلام کی بنیاد پر ہونی چاہیے۔ اسی خواہش کی تکمیل میں یہاں کے مسلمانوں نے مختلف ادوار میں مختلف دائروں میں جدوجہد کی۔ خود پاکستان کا وجود اس خواہش کا مظہر ہے۔ یہ ایک ایسا ملک ہے جس کے مختلف حصوں کے مابین سوائے اسلام کے رشتے کے اور کوئی دوسرا ایسا رشتہ موجود نہیں جو انہیں ایک دوسرے سے جوڑ سکے۔ یہ دو ایسے بازوؤں پر مشتمل ہے جن کے درمیان ایک ہزار میل کا فاصلہ حائل ہے اور بیچ میں ایک ایسی قوم کا غلبہ ہے جسے اسلام اور مسلمان کا نام بھی گوارا نہیں۔ پھر ان دونوں بازوؤں میں جو لوگ آباد ہیں ان میں بھی کوئی چیز (باقی ۹۳ پر)